

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

پچھلی اشاعت میں صرف ایک انسانی کمزوری، "نفسانیت" کے اثرات و نتائج پر گفتگو کی گئی تھی۔ اب ہم غیوب کے دوسرے بڑے بڑے خاندانوں کا جائزہ لے کر دیکھیں گے کہ وہ نفس انسانی کی کن کمزوریوں سے وجود میں آتے ہیں اور کس طرح اُس کم کو خراب کرتے ہیں جو انسانیت کی تعمیر و اصلاح کے لیے، خصوصاً اسلام کے دیے ہوئے اصول اور نقشہ کار پر کیا جائے۔

ان میں سے ایک پورا خاندان غیوب اُس کمزوری سے جنم لیتا ہے جس کے نیچے موزوں ترین نام "مزاج" کی بے اعتدالی ہے۔ نفسانیت کے مقابلے میں یہ ایک معصوم نوعیت کی کمزوری ہے، کیونکہ اس میں کسی بدیتی کسی بُرے جذبے، کسی ناپاک خواہش کا دخل نہیں ہوتا۔ لیکن خرابی پیدا کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نفسانیت کے بعد دوسرے نمبر پر آتی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کے اثرات و نتائج اتنے ہی خراب ہوتے ہیں جتنے نفسانیت کے اثرات و نتائج۔

مزاج کی بے اعتدالی کا فطری نتیجہ فطرتاً ہی بے اعتدالی اور عمل و سعی کی بے اعتدالی ہے، اور یہ چیز زندگی کے حقائق سے براہ راست متصادم ہوتی ہے۔ انسانی زندگی بے شمار تضاد و عداوت کی مصالحت اور بہت سے مختلف عوامل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں انسان رہتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے، انسانی افراد میں تو ہر ایک فرد ابھی ایسا ہی بنا دیا گیا ہے، اور انسانوں کے مٹنے سے جو اجتماعی ہیئت بنتی ہے اس کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اس زندگی میں کام کرنے کے لیے فکر و نظر کا ایسا توازن، اور سعی و عمل کا ایسا اعتدال درکار ہے جو مزاج کو کثرت کے توازن و اعتدال کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ حالات کے ہر پہلو پر نگاہ رکھی جائے۔ معاملات کے ہر رُخ کو دیکھا جائے۔ ضروریات کے ہر گوشے کو اس کا حق دیا جائے۔ فطرت کے

ہر تقاضے کو ملحوظ رکھا جائے۔ کمال درجے کا معیاری اعتدال چاہے نصیب نہ ہو، مگر یہاں کامیابی کے لیے بہر حال اعتدال ناگزیر ہے۔ جتنا بھی وہ معیار سے قریب ہوگا اتنا ہی مفید ہوگا، اور جس قدر وہ اس سے دور ہوگا اسی قدر زندگی کی حقیقتوں سے متصادم ہو کر نقصان کا موجب بنے گا۔ دنیا میں آج تک جتنا بھی فساد رونما ہوا ہے، اور آج رونما ہے، اسی وجہ سے ہے کہ غیر متوازن دماغوں نے انسانی مسائل کو یک رخ پن کے ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کی کوششیں کیں، ان کو حل کرنے کے لیے غیر متوازن اسکیمیں بنائیں، اور ان کو نافذ کرنے کے لیے غیر معتدل طریقے اختیار کیے۔ یہی گناہ کا اصل سبب ہے، اور بناؤ کا جو کچھ بھی کام ہو سکتا ہے، فکر و نظر کے توازن اور طریق عمل کے اعتدال ہی سے ہو سکتا ہے۔

یہ وصف خاص طور پر تعمیر و اصلاح کی اُس اسکیم کو نافذ کرنے کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے جو اسلام نے ہمیں دی ہے، کیونکہ وہ بجائے خود توازن و اعتدال کے انتہائی کمال کا نمونہ ہے۔ اُس کو کتابوں کے صفحات سے واقعات کی دنیا میں منتقل کرنے کے لیے تو خصوصیت کے ساتھ دسی کا رفرما اور کارکن موزوں ہو سکتے ہیں جن کی نظر اسلام کے نقشہ تعمیر کی طرح متوازن اور جن کا مزاج اسلام کے مزاج اصلاح کی طرح معتدل ہو۔ افراط و تفریط میں مبتلا ہونے والے انتہا پسند لوگ اس کام کو گناہ ٹو سکتے ہیں، بنا نہیں سکتے۔

نتیجہ کے اعتبار سے بے اعتدالی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ بالعموم ناگہمی کی موجب ہوتی ہے۔ نظام زندگی میں اصلاح و تعمیر کی کوئی اسکیم بھی ملے کر آپ اٹھیں، آپ کی کامیابی کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ خود اس کے برحق ہونے پر مطمئن ہوں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اپنے معاشرے کے عام انسانوں کو اس کے صحیح، مفید اور قابل عمل ہونے پر مطمئن کریں، اور اپنی تحریک کو اس شکل میں لائیں اور ایسے طریقے سے چلائیں جس سے لوگوں کی امیدیں اور نسبتیں اس کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ بات صرف اسی تحریک کو نصیب ہو سکتی ہے جو نظر و فکر میں بھی متوازن ہو اور طریق عمل میں بھی متوازن۔ ایک انتہا پسند اسکیم، جو انتہا پسندانہ طریقوں سے چلائی جائے، عام انسانوں میں اپنے لیے رغبت اور امید پیدا کرنے کے بجائے نفرت اور مایوسی پیدا کرتی ہے، قابل اور مطمئن کرنے کے بجائے معترض اور

غیر مطمئن بنتی ہے۔ اور اس کی یہ صفت خود ہی اس کی قوت تبلیغ اور قوت نفوذ کو ضائع کر دیتی ہے۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے کچھ انتہا پسند لوگ اکٹھے ہو بھی جائیں تو سارے معاشرے کو اپنے جیسا انتہا پسند بنالینا اور دنیا بھر کی آنکھیں حقائق سے بند کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

خود اس جماعت کے لیے بھی یہ چیز زہر کا حکم رکھتی ہے جو اجتماعی اصلاح و تعمیر کا کوئی پروگرام لے کر اٹھی ہو۔

مزاج کی بے اعتدالی کا اولین مظہر انسان کے ذہن کا ایک رخ پائین ہے۔ اس کیفیت میں مبتلا ہو کر آدمی بالعموم ہر چیز کا ایک رخ دیکھتا ہے، دوسرا رخ نہیں دیکھتا۔ ہر معاملے میں ایک پہلو کا کاغذ کرتا ہے، دوسرے کسی پہلو کا کاغذ نہیں کرتا۔ ایک سمت جس میں اس کا ذہن ایک دفعہ چل پڑتا ہے اُسی کی طرف وہ بڑھتا چلا جاتا ہے، دوسری سمتوں کی جانب توجہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اُس سے معاملات کو سمجھنے میں سلسل ایک خاص طرح کے عدم توازن کا ظہور ہوتا ہے۔ رائے قائم کرنے میں بھی وہ ایک ہی طرف جھکتا چلا جاتا ہے۔ جس چیز کو اہم سمجھ لیتا ہے بس اسی کو یکڑ بیٹھتا ہے، دوسری ایسی ہی اہم چیزیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم چیزیں اس کے نزدیک غیر موقع ہو جاتی ہیں۔ جس چیز کو بڑا سمجھ لیتا ہے اسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے، دوسری ٹوسی ہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی برائیاں اس کے نزدیک قابل توجہ نہیں ہوتیں۔ اصولیت اختیار کرتا ہے تو جمود کی حد تک اصول پرستی میں شہرت دکھانے لگتا ہے، کام کے عملی تقاضوں کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ عملیت کی طرف جھکتا ہے تو بے اصولی کی حد تک عملی بن جاتا ہے اور کامیابی کو مقصود بالذات بنا کر اس کے لیے ہر قسم کے وسائل و ذرائع استعمال کر ڈالنا چاہتا ہے۔

یہ کیفیت اگر اس حد پر نہ رک جائے تو آگے بڑھ کر یہ سخت انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر آدمی اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنے لگتا ہے۔ اختلاف رائے کے میں شدت سے برتنے لگتا ہے۔ دوسروں کے نقطہ نظر کو انصاف کے ساتھ نہ دیکھتا ہے، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ ہر مخالف رائے کو بدتر سے بدتر معنی پہنا کر ٹھکرانا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ دوسروں کے لیے اور دوسروں کو

اس کے لیے ناقابل برداشت بنائی چلی جاتی ہے۔

اس مقام پر بھی بے اعتدالی رک جائے تو خیریت ہے۔ لیکن اگر اسے خوبی سمجھ کر مزید پرسش کیا جائے تو پھر معاملہ بد مزاجی، اور چڑچڑے پن، اور تیز زبانی، اور دوسروں کی نیتوں پر شک اور حملوں تک پہنچ جاتا ہے جو کسی اجتماعی زندگی میں بھی سمجھنے والی چیز نہیں ہے۔

ایک آدمی یہ سوشل اختیار کرے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا کہ وہ اکیلا جماعت سے کٹ جائے گا اور اس مقصد کی خدمت سے محروم رہ جائے گا جس کی خاطر وہ جماعت سے وابستہ ہوا تھا۔ اس سے کوئی اجتماعی نقصان واقع نہ ہوگا۔ مگر جب کسی اجتماعی حیثیت میں بہت سے غیر متوازن ذہن اور غیر متدل مزاج جمع ہو جائیں تو پھر ایک ایک قسم کا عدم توازن ایک ایک ٹولی کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ ایک انتہا کے جواب میں دوسری انتہا پیدا ہوتی ہے۔ اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے جاتے ہیں۔ پھوس پڑتی ہے۔ دھڑے بندی ہوتی ہے۔ اور اس شکل میں وہ کام خراب ہو کر رہتا ہے جسے بنانے کے لیے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کچھ لوگ جمع ہوئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کام انفرادی کوششوں سے کرنے کے نہیں ہوتے، بلکہ جن کی نوعیت ہی اجتماعی ہوتی ہے، انہیں انجام دینے کے لیے بہر حال بہت سے لوگوں کو ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات سمجھانی اور دوسروں کی بات سمجھنی ہوتی ہے۔ طبیعتوں کا اختلاف، قابلیتوں کا اختلاف، ذاتی خصوصیات کا اختلاف اپنی جگہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود سب کو آپس میں موافقت کا ایک تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی تعاون ممکن نہیں ہوتا۔ اس موافقت کے لیے کسر و انکسار ناگزیر ہے۔ اور کسر و انکسار صرف متدل مزاج کے لوگوں ہی میں ہو سکتا ہے جن کے خیالات بھی متوازن ہوں اور طبیعتیں بھی متوازن۔ غیر متوازن لوگ جمع ہو چکی جائیں تو زیادہ دیر تک جمو رہ نہیں سکتے۔ ان کی جمعیت پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، اور جن ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر ایک ایک قسم کے عدم توازن کے مریض جمع ہوں گے، ان میں پھر تفرقہ رونما ہوگا، یہاں ©rasailojaraid.com غصہ یوں کے بغیر ہی کھڑا نظر آئے گا۔

جن لوگوں کو اسنادام کے لیے کام کرنا ہو، اور جنہیں جمع کرنے والی چیز اسلامی اصول پر نظام زندگی کی اصلاح و تعمیر کرنے کا جذبہ و دلولہ ہو، انہیں اپنا محاسبہ کر کے اس بے اعتدالی کی ہر شکل سے خود بھی بچنا چاہیے اور ان کی جماعت کو بھی یہ فکر ہونی چاہیے کہ اُس کے دائرے میں یہ مرض نشوونما نہ پائے۔ اس باب میں کتاب الشرا و سنت رسول اللہ کی وہ ہدایات اُن کے پیش نظر رہنی چاہئیں جو انتہا پسندی اور شدت سے منع کرتی ہیں۔ قرآن جس چیز کو اہل کتاب کی بنیادی غلطی قرار دیتا ہے وہ غلو فی الدین ہے (يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ)، اور اس سے بچنے کی تاکید نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین کو ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

ایاکم والغلو فاما هلك من كان قبلكم بالغلو فی الدین۔
خبردار! انتہا پسندی میں نہ پڑنا۔ کیونکہ تم سے پہلے کے لوگ دین میں انتہا پسندی اختیار کر کے ہی تباہ ہوئے۔

(مسند احمد بروایت ابن عباس)

ابن مسعود کی روایت ہے کہ حضور نے ایک تقریر میں تین بار فرمایا:-

هلك المتنطعون
برہادر ہو گئے شدت اختیار کرنے والے، ہمالے اور
نعمت سے کام لینے والے۔

دعوت محمدی کا امتیازی وصف اُس کے لانے والے نے یہ بتایا ہے کہ بُعثت بالحنیفۃ السمیۃ یعنی آپ پچھلی امتوں کی افراط و تفریط کے درمیان وہ حنیفیت لے کر آئے ہیں جس میں وسعت اور سادگی زندگی کے ہر پہلو کی رعایت ہے۔ اس دعوت کے علم برداروں کو جس طریقے پر کام کرنا چاہیے وہ اس کے داعی اول نے یہ سکھایا ہے:-

یسر واولا تعسر واولو بشر واولا تنفروا
سہولت دو، تنگ نہ کرو، بشارت دو، نفرت نہ دلاؤ۔
(بخاری و مسلم)

انما بعثتم ميسرين ولم بعثكم معشرين
تم سہولت دینے کے لیے بھیجے گئے ہو۔ تنگ نہ کرو۔

معسرین - (بخاری)

کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بین امرین قطاً الا اخذ ایسرہما مالہ
یکن اثماً

نہی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
دو معاملوں میں سے ایک کے اختیار کرنے کا موقع
دیا گیا ہو اور آپ نے ان میں سے آسان تو نہیں نا کو
نہ اختیار کیا ہو، الایہ کہ وہ گناہ ہو۔

(بخاری و مسلم)

ان اللہ رفیق یحب الرفق فی الامر

اللہ نرم خو ہے، ہر معاملے میں نرم رویے کو پسند
کرتا ہے۔

(بخاری و مسلم)

من یحرم الرفق یحرم الخیر کلہ

جو نرم خوئی سے محروم ہوا وہ بھلائی سے بالکل محروم
ہو گیا۔

(مسلم)

ان اللہ رفیق یحب الرفق ویعطی علی

اللہ نرم خو ہے اور نرم خواہی کو پسند کرتا ہے۔ وہ
نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو شدت پر اور کسی دوسرے
درجے پر عطا نہیں کرتا۔

الرفق ما لا یعطی علی العنف وما لا

یعطی علی ما سواہ (مسلم)

ان جامع ہدایات کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ، اسلامی نظام زندگی کے لیے کام کرنے والے لوگ
اگر قرآن و سنت سے اپنے مطلب کی چیزیں چھانٹنے کے بجائے اپنے مزاج اور نقطہ نظر کو ان کے
مطابق ڈھالنے کی عادت ڈالیں تو ان کے اندر آپ سے آپ وہ توازن اور توسط و اعتدال پیدا
ہونا چلا جائے گا جو دنیا کے حالات و معاملات کو قرآن و سنت کے دیے ہوئے نقشے پر درست
کرنے کے لیے درکار ہے۔

بے اعتدالی مزاج سے ملتی جلتی ایک اور کمزوری بھی انسان میں ہوتی ہے جسے تنگ دلی کے نام
سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جسے قرآن میں ”شَحْنَفْس“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ
فلاح اس شخص کے لیے ہے جو اس سے بچ گیا (وَمَنْ بَخِلَ نَفْسَهُ فَيُرْسِدْهَا حَوْلًا فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ)

اور جسے قرآن تقویٰ اور احسان کے برعکس ایک غلط میدان قرار دیتا ہے (وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحْرَ وَاَنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا)۔ اس مرض میں جو شخص مبتلا ہو وہ اپنی زندگی کے ماحول میں دوسروں کے لیے کم ہی گنجائش چھوڑنا چاہتا ہے۔ وہ خود جتنا بھی پھیل جائے، اپنی جگہ اسے تنگ ہی نظر آتی ہے، اور دوسرے جس قدر بھی اس کے لیے سکر جانیں اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ درست پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنے لیے وہ ہر رعایت چاہتا ہے، مگر دوسروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کر سکتا۔ اپنی خوبیاں اس کے نزدیک ایک صفت ہوتی ہیں اور دوسروں کی خرابیاں محض ایک اتفاقی حادثہ۔ اپنے عیوب اس کی نگاہ میں قابل معافی ہوتے ہیں، مگر دوسروں کا کوئی عیب وہ معاف نہیں کر سکتا۔ اپنی مشکلات کو تو وہ مشکلات سمجھتا ہے، مگر دوسروں کی مشکلات اس کی رائے میں محض بہانہ ہوتی ہیں۔ اپنی کمزوریوں کے جوا لائوس وہ خود چاہتا ہے دوسروں کو وہ الائوس دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ دوسروں کی مجبوریوں کی پھر ذرا کیے بغیر وہ اُن سے وہ انتہائی مطالبات کرتا ہے جو خود اپنی مجبوری کی صورت میں وہ کبھی پورے نہ کر سکے۔ اپنی پسند اور اپنا ذوق وہ دوسروں پر ٹھونسنے یا کوشش کرتا ہے۔ مگر دوسروں کی پسند اور ان کے ذوق کا لحاظ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ چیز ترقی کرتی رہے تو آگے چل کر خود وہ گیری و عیب جی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ دوسروں کی ذرا ذرا سی باتوں پر آدمی گرفت کرنے لگتا ہے، اور پھر جوابی عیب بتی پر مبتلا اٹھتا ہے۔

اسی تنگ دلی کی ایک اور شکل زود رنجی، تک چڑھا پن، اور ایک دوسرے کو ہر داشت نہ کرنا ہے۔ جو اجتماعی زندگی میں اُس شخص کے لیے بھی مصیبت ہے جو اس میں مبتلا ہو اور اُن لوگوں کے لیے بھی مصیبت جنہیں ایسے شخص سے واسطہ پڑے۔

کسی جماعت کے اندر اس بیماری کا گھس آنا حقیقت میں ایک خطرہ کی علامت ہے۔ اجتماعی جذبہ ہمہ حال اس کی باعث اور باہمی تعاون چاہتی ہے جس کے بغیر پار آدمی بھی نہ کر کے۔ مگر یہ تنگ دلی اس کے امکانات کو کم ہی نہیں، بسا اوقات ختم کر دیتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ تعلقات کی ٹپنی اور باہمی